بندوں میں یہ تفریق قائم کرے اور اپنے قانون انصاف و عدل کو خواہ مخواہ توڑے ـــــ اس لئے اس قول کا مبنیٰ بظاہر یہی سمجھ میں آتا ہے کہ ایسا کہنے والے وہی لوگ ہو سکتے تھے۔ جن کا رشتہ ان کے مآخذ دینی سے منقطع ہو چکا تھا اور ان میں ٹھیک ٹھیک دینی تعلیم کی جگہ عصبیت و غرور نے لے لی تھی اور یہ ہمہ گیر قاعدہ ہے کہ جب کوئی قوم مذہب کی رُو سے بے گانہ ہو جائے اور سعی و عمل کی روح سے محروم ہو جائے تب لامحالہ اس انداز کے توہمات اس کے اندر پھیلتے اور مقبول ہوتے ہیں۔ اور وہ کردار و سیرت سے محروم ہونے پر بھی یہی سمجھتی ہے کہ اس سے کچھ نہیں بگڑا۔ نجات بہر حال ہو ہی جائے گی۔

پاداش عمل کا اصول: قرآن نے پہلے تو نہایت حکیمانہ پیرائے میں یہ بیان کیا کہ یہ لاعلمی کی باتیں ہیں۔ وہ خدا جس کو اپنی پوری مخلوق سے محبت ہے اور جو پوری کائنات انسانی سے یکساں تعلق رکھتا ہے کیونکر ایسا وعدہ کر سکتا ہے۔ ام تقولون علی اللہ ما لا تعلمون۔ پھر اس کے بعد معصیت اور پاداش عمل سے متعلق ایک جچا تلا اصول بیان فرمایا کہ نجات کا معاملہ توہمات و ظنون کا معاملہ نہیں۔ عمل و کردار کا معاملہ ہے۔ ان لوگوں کو اس حقیقت پر غور کرنا چاہیئے کہ یہ جس راہ پر گامزن ہیں وہ گناہ و نافرمانی کی راہ ہے یا اللہ کی فرمانبرداری و اطاعت شعاری کی ـــــ پھر ان کو اس چیز پر بھی غور کرنا چاہیئے کہ یہ جن تصورات کو مان رہے ہیں اور جن خواہشات نفس کا نام انھوں نے یہودیت رکھ چھوڑا ہے اور جس کو نجات اخروی کا یہ واحد وسیلہ قرار دے رہے ہیں، آیا ان کو تقویٰ و پرہیزگاری کی منزل کی طرف لے جا رہی ہے یا ان تصورات اور اس طرح کے پندار و غرور دینی سے ان میں انفرادی اور اجتماعی گمراہیاں پھیل رہی ہیں۔ اگر ان تصورات سے ان کی اشاعت ہوتی ہو، اور ان عقائد و مزعومات کو تسلیم کر کے ان میں خدا ترسی کے پاکیزہ جذبات ابھرتے ہیں ـــــ تب ان کی نجات میں کیا شبہ ہے؟ لیکن اگر مسخ شدہ یہودیت سے جس میں بجز قومی تعصب و غرور کے اور کسی لطیف جذبہ کی تسکین نہیں ہوتی۔ ان میں معصیت و گناہ کی چنگاریاں بھڑکتی ہیں اور چاروں طرف سے اللہ کی نافرمانی گھیر لیتی ہے تب صرف اس عنوان اور چھاپ سے کیا فائدہ پہنچ سکتا ہے ـــــ مذہب کی اصل حقیقت تو نیکی اور پاکبازی ہے۔ اگر ایک شخص دنیا میں اس نعمت سے اس درجہ محروم ہے کہ انفرادی اور اجتماعی چوکھٹوں میں کہیں اصلاح و خیر کے آثار موجود نہیں تو عقبیٰ و آخرت میں کس بل بوتے پر نجات کی توقع کی جا سکتی ہے۔ اور اگر ایک پوری قوم کا یہ حال ہو کہ قساوت قلبی اور دنیا طلبی کی گوناگوں خواہشوں نے اس کا احاطہ کر رکھا ہو۔ تو نجات کا حصول اور بھی مستبعد ہو جاتا ہے۔

نحوی لطیفہ: یہاں یہ نکتہ لائق غور ہے کہ اَمْ جس کا ترجمہ اُردو میں عموماً "یا" ہے شک اور تردد کے لئے نہیں۔ بلکہ احد الطرفین کے اثبات کے لئے ہے ـــــ اس صورت میں ام کو بَل کے معنوں میں قرار دیجئے اور یوں ترجمہ کیجئے۔ کہ بلکہ تم اللہ پر افترا کرتے ہو ـــــ قرآن میں اس طرح کی اور مثالیں بھی ہیں۔ جیسے حضرت یوسفؑ اپنے جیل کے ساتھیوں سے فرماتے ہیں: ارباب متفرقون خیر ام اللہ الواحد القہار (یوسف) کیا مختلف خداؤں کا تصور خوب ہے یا ایک خدائے قاہر کا ـــــ اگرچہ انداز سوال کا ہے مگر مقصود یہی ہے کہ ایک خدائے قہار ہی کا تصور بہتر ہے۔

ایک نکتہ: علامہ جصاص المتوفی ۳۷۰ھ نے اس آیت سے یہ استدلال کیا ہے کہ اگر کوئی شخص دو شرطوں پر اپنی

قسم ویمین کو مبنی ٹھہراتا ہے۔ تو جب تک یہ دونوں شرطیں منتفی نہیں ہو جاتیں۔ شرعاً وہ حانث نہیں ہوگا۔ یعنی اس کی قسم نہیں ٹوٹے گی ـــــ کیونکہ یہاں جہنم کے استحقاق کے لئے قرآن حکیم نے دو باتوں کو الگ الگ موجب وسبب قرار دیا ہے۔ ایک کسب سیئہ اور دوسرے احاطہ خطیئات۔ اب اگر صرف کسب سیئہ ہی کا وجود ہے اور احاطہ خطیئات نہیں ہے تو تنہا یہ جہنم و دوزخ کو مستلزم نہیں۔

غور کیجئے گا۔ تو یہ استدلال غلط نظر آئے گا۔ کیونکہ سیئہ سے مراد اس جگہ ایک گناہ نہیں بلکہ گناہ کی مخصوص نوعیت ہے جو بہت سے گناہوں کو مستلزم ہے۔ اس صورت میں کسب سیئہ اور احاطہ خطیئات ایک ہی چیز قرار پاتی ہے۔ دو الگ الگ شرطیں نہیں ـــــ خود معاملہ کے نقطۂ نظر سے بھی یہ کلیہ نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ دیکھنا یہ ہے کہ جو دو شرطیں بیان کی گئی ہیں ان کا مزاج کیسا ہے؟ کون ان میں مقصود بالذات ہے اور کون مقصود بالتبع ـــــ کون اصلی وحقیقی شرط ہے اور کون اس کا لازمی و منطقی نتیجہ ـــــ پھر جو مقصود بالذات اور اصلی وحقیقی شرط ہوگی۔ اس کی خلاف ورزی پر حانث ہوگا۔ اگرچہ دوسری شرط بالفعل نہ ہی پائی جائے۔

قرآن اور علمِ جدید

(مصنفہ ڈاکٹر محمد رفیع الدین)

اس کتاب میں آیاتِ قرآنی سے استدلال کر کے مغرب کے اُن تمام نظریات کی علمی اور عقلی تردید کی گئی ہے۔ جو قرآن کو چیلنج کرتے ہیں۔ لیکن دورِ حاضر میں بالعموم قبول کئے جاتے ہیں۔ مثلاً ڈارون کا نظریۂ ارتقاء۔ میکڈوگل کا نظریۂ جبلت۔ فرائڈ کا نظریۂ لاشعور۔ ایڈلر کا نظریۂ لاشعور۔ کارل مارکس کا نظریۂ اشتراکیت۔ اور میکیاولی کا نظریۂ وطنیت۔ ان نظریات کی تردید کرتے ہوئے مصنف نے فلسفہ اور سائنس کے ان تمام حقائق کو بھی واضح کیا ہے۔ جو رُوحِ قرآن سے مطابقت رکھتے ہیں اور علمی اعتبار سے بھی درست مانے جاتے ہیں۔ اس عمل کا نتیجہ نہ صرف یہ ہوا کہ علمِ جدید کے سارے طول وعرض میں سے علمی صداقتیں باطل سے جدا ہو ہو کر اسلام کی تائید کے لئے مہیا ہو گئی ہیں، بلکہ باطل نظریات کی خامیاں بھی واضح ہو گئی ہیں۔ اس کتاب میں یہ بھی بتایا گیا ہے، کہ ارتقا اور لاشعور کے اسلامی نظریات کیا ہیں۔ نیز سیاست اور اقتصادیات کے متعلق اسلام کا کیا تصور ہے یہ کتاب نہ صرف مغرب کے باطل نظریات کی تردید ہے، بلکہ اسلامی نظریۂ انسان و کائنات کی ایک مکمل علمی تشریح بھی ہے۔ قیمت پانچ روپے آٹھ آنے۔

ملنے کا پتہ

سکریٹری، ادارۂ ثقافتِ اسلامیہ۔ ۲ کلب روڈ۔ لاہور۔ پاکستان

محمد جعفر شاہ ندوی

ایک حدیث

خطا کاری

ترمذی میں سیدنا انسؓ سے حضورؐ کا ایک فرمان یوں مروی ہے:

کل بنی آدم خطّاء وخیر الخطائین التوابون۔

بنی آدم بڑے ہی خطا کار ہوتے ہیں لیکن بہترین خطا کار وہ لوگ ہیں جو بڑے توبہ کرنے والے بھی ہوں۔

عبارت اور اس کا ترجمہ دونوں بہت صاف اور واضح ہیں۔ مضمون بہت سادہ اور مختصر ہے۔ لیکن اس کوزے میں داستانِ فطرتِ انسانی کا ایک بڑا اتھاہ سمندر بند ہے۔ بنی آدم کی پوری تاریخ اور فطرتِ انسانی کی ساری داستان میں جو حقیقت سب سے زیادہ ابھری ہوئی نظر آتی ہے وہ اس کی لغزشیں، خطائیں، ٹھوکریں، غلطیاں ہی ہیں ــــ انسان صرف ظلوم و جہول، کفور و عجول ہی نہیں وہ خطّاء (بڑا ہی خطا کار) بھی ہے۔ اتنا خطا کار کہ کہنے والوں کو آخر یہ فیصلہ کرنا پڑا کہ الانسان مرکبٌ من الخطاء والنسیان۔ انسان کی تو ترکیب ہی خطا و نسیان سے ہوتی ہے۔ فی الواقع یہ ناممکن ہے کہ کوئی ذی روح جامۂ بشریت پہن کر دنیا میں آئے اور وہ غلطی اور بھول سے پاک ہو۔

اس پوری کائنات پر ایک نگاہِ تجسس ڈالئے۔ کوئی ذی روح یا غیر ذی روح مخلوق ایسی نہیں جو خطا کرتی ہو۔ پہاڑ اور دریا غلطی نہیں کرتے۔ کواکب و سیارات خطا کے مرتکب نہیں ہوتے۔ نباتات سے کوئی لغزش نہیں ہوتی۔ کسی رینگنے والے کیڑے، چرنے والے چوپائے، اڑنے والے پرندے اور پھاڑنے والے درندے سے چوک نہیں ہوتی۔ لیکن سب سے زیادہ ارتقا یافتہ اور اشرف ترین مخلوق ــــ انسان ــــ؟ کچھ نہ پوچھئے۔ خطاؤں کا مجسمہ، لغزشوں کا پتلا اور غلطیوں کا مجموعہ۔ اور عجیب بات یہ ہے کہ یہی وہ "شر" ہے جو اس کا طرۂ شرف و امتیاز ہے اور سببِ "خیر کثیر" ہے۔ یہ نہ ہو تو انسان شرفِ انسانیت سے نیچے گر کر نباتات و جمادات کی صف میں شامل ہو جاتا ہے اور یہ ہو تو یہی زینۂ ارتقا بن جاتا ہے۔ یہ عجیب شر ہے جو اپنے جلو میں بے شمار خیر لئے ہوئے ہے۔

ہاں "خطا" کے معنی بھی لینا چاہیئے۔ اس سے اس حدیث کو سمجھنے میں بھی بڑی مدد ملے گی:

ہر وہ فعل جو اپنے ارادے کے خلاف ہو خطا ہوتا ہے۔ نیت بخیر ہو مگر نتیجہ غلط نکلے، نیت درست نہ ہو اور نتیجہ خیر ہو۔ دونوں ہی خطا ہیں۔ نشانہ شکار پر ہو اور لگ جائے کسی انسان کو یا اس کے برعکس نشانہ ہو انسان اور جا بیٹھے کسی درندے پر۔ خطا دونوں ہی ہیں۔ پہلے پر عنداللہ گرفت نہیں مگر عندالناس ہے۔ اور دوسرے پر عنداللہ گرفت ہے اور عندالناس

نہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ عند القضاء توقوع پر گرفت ہوتی ہے۔ اور عند اللہ نیت پر۔

اور اگر غلط نیت کے مطابق ہی عمل کا بھی ظہور ہو تو عند اللہ بھی گرفت ہے اور عند الناس بھی۔ یعنی اگر انسان ہی کو نشانہ بنایا جائے اور وہ نشانہ بیٹھے بھی انسان ہی پر تو عند اللہ بھی گرفت ہے اور عند القضاء بھی۔ قرآنی زبان میں بڑے سے بڑا جرم بھی خطاء ہے۔ مثلاً ان قتلهم كان خطاء كبيرا ٥ (ان کا قتل بڑی خطا تھی)۔ اور چھوٹے گناہ بھی خطا میں داخل ہیں۔ مثلاً: نغفر لكم خطايا كم (ہم تمہارے گناہ معاف کر دیں گے) حتیٰ کہ وہ چھوٹی چھوٹی لغزشیں بھی خطا میں داخل ہیں جو قابلِ گرفت ہی نہیں مثلاً ليس عليكم جناح فيما اخطاتم به۔ (خطاؤں میں تم پر کوئی گناہ نہیں)

زیر بحث حدیث میں سب طرح کی خطائیں داخل ہیں۔ بڑے سے بڑا گناہ بھی اور چھوٹی سی چھوٹی لغزش بھی۔ یہ سب کچھ انسان کی فطرت میں داخل ہیں۔ البتہ انسانی درجات کے مطابق ہی ان خطاؤں کا وزن متعین ہوتا ہے۔ ایک معمولی سی خطا ایک مقرب کے لئے بڑا گناہ ہوتا ہے اور ایک بڑا گناہ معمولی انسان کے لئے قابلِ درگزر ہوتا ہے۔

جہاں تک ذنوب و معاصی کا تعلق ہے خطائیں یہ بھی ہیں اور یہ خطائیں بالعمد ہی ہوا کرتی ہیں۔ یہ خطائیں اصغر الصغائر سے لے کر اکبر الکبائر تک مختلف درجات رکھتی ہیں۔ ان کے متعلق عام اہل اسلام کا عقیدہ یہ ہے کہ سعید روحیں ان کے بالعمد ارتکاب سے محفوظ ہوتی ہیں۔ مثلاً انبیا کی جبلت و سرشت ہی ایسے خمیر سے ہوتی ہے کہ ان سے کوئی معصیت نہیں ہوتی۔ کبائر کا تو ذکر ہی کیا ہے صغائر بھی ان سے بالعمد نہیں ہوتے۔ ہاں بہت معمولی صغائر ہو جاتے ہیں لیکن وہ بھی اس طور پر کہ ان کے ارتکاب میں نہ ان کی نیت کو کوئی دخل ہوتا ہے نہ قصد و عمد کو بلکہ بلا ارادہ و نیت کسی غلط فہمی سے کوئی چوک ایسی ہو جاتی ہے جس میں ہوتے تو ہیں وہ نیک نیت، لیکن نتیجہ کچھ غلط سا ہو جاتا ہے۔ بہر حال خطا یہ بھی ہے۔ گویا دوسرے لفظوں میں ہم یوں کہہ سکتے ہیں کہ انبیا معصوم عن المعصیت تو ہوتے ہیں معصوم عن الخطا نہیں ہوتے یعنی وہ کسی گناہ کا ارتکاب بلکہ ارادہ بھی نہیں کرتے مگر لغزش، چوک اور غلط فہمی ہو جاتی ہے اور ان کی رفعتِ مقام کی وجہ سے اللہ تعالیٰ ایسے مواقع پر بھی ان سے باز پرس یا تنبیہ فرماتا ہے۔ قرآن پاک میں اس کی بے شمار مثالیں موجود ہیں۔ بہر حال زیر بحث حدیث میں کل بنی آدم خطاء (تمام بنی آدم خطا کار ہیں) کی کلیت اپنی جگہ صحیح ہے اور مراتب اور اندازِ مواخذہ کے فرق کے ساتھ انبیاء و اولیا بھی اسی کلیت سے باہر نہیں۔

اس حقیقت کی تائید میں قرآن پاک کی وہ آیات پیشِ نظر رکھنی چاہیے جن کا تعلق قصۂ آدم سے ہے۔ یہ قصۂ آدم کوئی ڈرامہ نہیں جو اللہ میاں کے سامنے کھیلا گیا ہو بلکہ یہ فطرتِ بشری، فطرتِ مَلکی اور فطرتِ شیطانی کی داستان ہے زبانِ حال سے۔ ایک حقیقت ہے جسے تمثیلی زبان میں تمثیلچہ بنا کر پیش کیا گیا ہے۔ یہاں آدم سے مراد ہی نوعِ بشری ہے جس کی سرشت میں خطا کاریاں موجود ہیں۔ دوسری طرف نوعِ مَلک ہے جس کی فطرت معصوم ہے۔ لیکن یہ تماشا بھی دیکھنے کے لائق ہے کہ ملائکہ معصومینؑ کے ہوتے بھی تاجِ خلافت خطا کار آدم کے سر پر رکھ دیا گیا۔

اتنا ہی نہیں بلکہ اس خطاکار کے آگے معصوموں کے ہجوم کو سجدہ ریز کر دیا گیا۔ اور یہ حکم سجدہ اتنا زوردار تھا کہ جس نے اس سے انکار کیا اسے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے راندہ دیا گیا۔

ذرا سوچئے کہ آخر یہ خطاکاری کون سی ایسی صفت ہے جس نے معصوموں کو بھی اپنے آگے جھکا لیا؟ سچ پوچھئے تو محض معصومیت کوئی بڑا کمال نہیں۔ معصوم تو شیر خوار بچہ بھی ہوتا ہے تو کیا آپ کوئی منصب امامت و خطابت اس کے سپرد کریں گے؟ معصوم تو ہر حیوانِ مطلق، ہر شجر و حجر ہوتا ہے، تو کیا آپ ان کو مستحق خلافت ٹھہرائیں گے؟ معصوم تو ملائکہ بھی ہیں لیکن کیا خدا نے ان کو زمین کا خلیفہ بنایا؟ — آخر اس خطاکاری میں کون سی خیر اور کون سا حسن و جمال تھا جو منصبِ خلافت کے لئے نوعِ بشر کو منتخب کر لیا گیا؟ بات کچھ زیادہ پیچیدہ نہیں معصومیت میں ارتقا نہیں ہوتا۔ معصوم نہ گھٹے نہ بڑھے۔ وہ جوں کا توں رہتا ہے۔ شجر، شجر ہی رہتا ہے اور حجر حجر ہی رہے گا۔ پرندہ پرندہ ہی رہتا ہے اور درندہ درندہ ہی رہے گا۔ نہ اس میں کوئی تنزل ہے نہ ترقی۔ یہ سب بے خطا ہیں اور بے خطا ہی رہیں گے لیکن انسان؟ خطا و نسیان کا مجموعہ ہے۔ یہ ٹھوکر کھاتا ہے اور سنبھلتا ہے۔ غلطی کرتا ہے اور تلافی کرتا ہے۔ اس میں ترقی اور تنزل دونوں کے بھرپور امکانات موجود ہیں۔ یہ چاہے تو اپنی خطاکاریوں سے اپنے آپ کو گرا کر چوپایوں کی صف میں لے آئے بلکہ ان سے بھی بدتر ہو جائے اور چاہے تو اپنی خطاکاریوں کی غیر معمولی تلافی کر کے نہ فقط اپنے داغ کو دھو دے بلکہ پہلے سے زیادہ چمک اٹھے۔ انسان صرف قانون تکوینی کا پابند نہیں بنایا گیا ہے — تقدیر کے پابند نباتات و جمادات — بلکہ اختیارات کی لامحدود دنیا اس کے سپرد کی گئی ہے۔ یہ چاہے تو خطا کر کے ابلیس سے بھی اپنے آپ پر لعنت کرائے اور چاہے تو توبہ و انابت کے بعد فرشتوں سے بھی اپنے آپ کو سجدہ کرائے۔ وھدینٰہ النجدین ——— اور إمّا شاکرًا وامّا کفورًا۔ سب کچھ اس کے حیطۂ اقتدار و اختیار میں ہے۔ صلاحیت خطا نہ ہوتی تو یہ رتبہ و منصب کہاں سے حاصل ہوتا؟ یہی سبب ہے کہ جہاں حضور اکرمؐ نے یہ فرمایا کہ:

كل بنى آدم خطاء

تمام بنی آدم خطاکار ہیں

وہیں یہ بھی بتا دیا کہ: وخیر الخطائین التوابون

بہترین خطاکار وہ ہیں جو توبہ کر کے تلافی کر لیتے ہیں

معصومیت میں یہ کمال کہاں؟ یہ شرف تو خطاکاری ہی کو حاصل ہے کہ یہ انسان کو جتنا نیچے لے جاتی ہے توبہ اس سے کہیں زیادہ اونچا لے جاتی ہے۔

یہ حدیث ایک بہت بڑے نفسیاتی مرض کا علاج بھی ہے۔ کمزور طبائع کے انسان احساس زیادہ ہوتے ہیں۔ ان سے کوئی غلطی ہو جائے تو ان کا دل بیٹھنے لگتا ہے ہمتیں پست ہو جاتی ہیں اور یاس و ناامیدی کی گھٹائیں چھانے لگتی ہیں۔ اس

حدیث میں یہی حقیقت بتائی گئی ہے کہ خطا تو انسان کی سرشت میں موجود ہے اس لئے اس سے شکستہ خاطر ہونے کی بجائے اس کی تلافی میں لگ جانا چاہیئے۔ اگر انسان اپنی ہر خطا پر وقفِ ماتم ہو کر بیٹھ جائے تو کوئی ارتقائی قدم نہیں اُٹھ سکتا۔ انسانی ترقی اسی میں مضمر ہے کہ ٹھوکر کھا کر سنبھلے مگر چلتا جائے۔ کوشش یہ کرے کہ اب پھر ایسی ٹھوکر نہ لگے اور جو ٹھوکر لگ چکی ہے اس کی ایسی تلافی ہو کہ داغ دھل جائے اور چمک اٹھے۔ اپنی سیاہی کے گرد حسن و جمال کا اتنا بڑا حلقہ بنائے کہ وہ داغِ سیاہ خالِ رخ کی طرح زیبائشِ حسن کو دوبالا کرے۔ اور اسی طرح اپنی ساری عمر اسی جدوجہد کیلئے وقف کرے۔

خطاکاریوں کے بعد مایوس ہو کر بیٹھ جانا اور حد سے زیادہ اثر لیتے رہنا خود ایک بہت بڑی خطا ہے۔ بیشتر خطا کے لئے ہے خطا بشر کے لئے۔ احساس گناہ و خطا ہی مفید ہے جو مایوس نہ کرے بلکہ تلافی پر ابھارے اور بے چین کر دے۔ اسی کا نام ہے توبہ؛ اور یہی ہے وہ بشارت جو زیرِ بحث حدیث میں یوں دی گئی ہے کہ:

وخیر الخطائین التوابون

بہترین خطاکار وہ ہیں جو توبہ کرتے ہیں

توبہ کے معنی زبان سے "توبہ توبہ" کی تکرار کرنا نہیں۔ بلکہ اس کا مطلب ہے اپنے صحیح مقام پر لوٹ آنا۔ اس کی بہت سی شکلیں ہیں۔ یہاں ان سے بحث نہیں۔ توبہ کا خلاصہ صرف یہ ہے کہ اس غلطی کا اپنے امکان بھر پھر اعادہ نہ کیا جائے اور جو کچھ ہو چکا ہے اس کو اپنی "صواب کاریوں" سے ڈھانپ لیا جائے۔ اسی ڈھانپنے کو مغفرت کہتے ہیں۔

اس مضمونِ حدیث کی تائید میں ایک بڑی معنی خیز حدیث اور بھی ہے جو مسلم نے ابوہریرہؓ سے روایت کی ہے حضورؐ نے فرمایا:

والذی نفسی بیدہ لولم تذنبوا لذھب اللہ بکم ولجاء بقوم یذنبون فیستغفرون فیغفر لھم۔

قسم ہے اُس ذات کی جس کے قبضے میں میری جان ہے اگر تم ارتکابِ گناہ ہی نہ کرتے تو اللہ تمہیں رخصت کر کے ایک ایسی اُمت کو پیدا کر دیتا جو گناہ کر کے مغفرت طلب کرتی اور اللہ ان کی مغفرت فرماتا۔

اس کا یہ مطلب نہیں کہ بالعمد گناہ ضرور کرنا چاہیئے۔ اس میں دراصل فطرت انسانی کو بتایا گیا ہے کہ بہرحال گناہ اس سے ہو ہی جاتا ہے۔ اگر نہ ہوتا تو انسان زیادہ سے زیادہ معصوم فرشتہ ہوتا، یا بے گناہ جانور۔ پھر خلافتِ ارضی کے لئے آخر ایک دوسری ہی مخلوق کی ضرورت ہوتی جو انسان کی طرح امکانِ خطا کے ساتھ ساتھ امکانِ ارتقا کی حامل ہوتی۔

غرض انسان عجیب مخلوق ہے جس کی خیر اس کے شر سے وابستہ ہے اور اس کا ارتقا اس کی خطاکاریوں کے پہلو بہ پہلو ہے۔

سوال و جواب

مجلۂ ثقافت

جناب ڈاکٹر سید محمد عبداللہ صاحب ایم اے ڈی لٹ پرنسپل اورینٹل کالج، لاہور (یونیورسٹی پروفیسر صدر شعبۂ اردو، پنجاب یونیورسٹی) نے ماہنامہ "ثقافت" پر تبصرہ کرتے ہوئے ایک مفصل مراسلہ ارسال فرمایا ہے۔ ہم قارئین کی دلچسپی کے لئے اس اہم تبصرے کو درج کرتے ہیں:

یونیورسٹی اورینٹل کالج

۱۸ فروری ۵۵ء

مخدوم من ڈاکٹر خلیفہ صاحب۔ سلام مسنون۔

ماہنامہ "ثقافت" کا پہلا پرچہ نظر سے گزرا۔ دلی مبارک باد قبول کیجئے۔ مگر میرا دل چاہتا ہے کہ اپنے احساسات کو صرف رسمی تبریک و تحسین تک محدود نہ رکھوں۔ بلکہ اس تبریک کے کچھ وجوہ بھی بیان کروں۔ تاکہ ادارہ ثقافت کو یہ اطمینان ہو کہ ان کی اس گراں قدر کوشش کے متعلق قارئین کا نقطۂ نظر اور احساس کیا ہے۔ اور درحقیقت یہ اظہار اس معاہدہ ذہنی یا معہود ذہنی کی تکمیل ہے جو کہ ایک مجلہ اور اس کے قارئین کے مابین ایک سبیل مفاہمت پیدا کرتی ہے۔

ماہنامہ ثقافت کی اس اشاعت اولین میں جو چیز مجھے سب سے زیادہ پسند آئی ہے۔ وہ اس کے اغراض و مقاصد کی بحث ہے۔ جو محض افتتاحیہ کی حیثیت نہیں رکھتی بلکہ اداریہ کی عام رسمی اور عرضی حدود سے بہت آگے نکل کر ایک علمی مقالہ یا فاضلانہ مضمون کی حد میں داخل ہو گئی ہے۔ اس میں آپ نے اپنے اساسی مقاصد پر جس جامع شگفتہ اور دلچسپ انداز میں بحث کی ہے۔ لائق تعریف ہے۔ بلکہ یوں کہوں کہ محتاج تعریف نہیں۔ آپ نے بڑے اچھے انداز میں قارئین کو بتایا ہے، کہ ثقافت میں کیا نہیں ہوگا۔ اور پھر یہ بھی بتایا ہے کہ ثقافت میں کیا ہوگا۔ ان دونوں حد بندیوں سے آپ نے اپنے اس پرچے کے اغراض و مقاصد کو خوب واضح کر دیا ہے۔ جس کے پڑھنے سے وہ سب تصورات ایک "آئینہ تمثال دار" کی طرح متشکل ہو کر ذہن و خیال کے سامنے آ گئے ہیں جو آپ کے پیش نظر ہیں۔ اور کچھ کچھ نقشہ قائم ہو جاتا ہے۔ ان فکری تعمیرات کا جن سے آپ کی یہ نئی دنیا معمور و آباد ہوگی۔ دعا ہے کہ آپ کی یہ مساعی وہ پھل پھول لائیں۔ جن کے طراوت بخش رنگ اور روح افزا خوشبو سے ہمارا یہ دور اور آنے والے سب ادوار لذت گیر اور راحت اندوز ہوں۔ آپ کی تصریحات کو بغور پڑھنے سے چند اصولی سوالات میرے ذہن میں پیدا ہوئے ہیں۔ جن کے معاملے میں میں آپ کو اپنا شریک راز بنانا ضروری خیال کرتا ہوں۔ ثقافت کے سلسلے میں ایک بنیادی سوال یہ پیدا ہوتا ہے۔ کہ آخر ثقافت سے ہماری مراد کیا ہے؟ کیا یہ کسی منظم مسلک

عمل کا نام ہے یا محض من کی موج یا مجرد فکر یا کوئی اندازِ حیات ہے۔ یا ان سب کا مجموعہ ہے۔ اس کا تعلق فرد کے اعمال و عادات سے ہے۔ یا یہ اس اجتماعی یک رنگی اور سماجی تنظیم کا نام ہے جس کو وحدتِ قومی بھی کہا جا سکتا ہے۔ پھر یہ بھی کہ اس کے نفوذ کے سرچشمے داخلی ہیں یا خارجی یا ایسے کہ باطن میں پوشیدہ رہ کر خارجی کو الف زندگی پر اثر انداز ہوتے رہتے ہیں۔ میں نے ثقافت کے متعلق آپ کے خیالات ہمایوں میں بھی پڑھے تھے۔ مگر ان سے بھی قطعی طور پر یہ واضح نہ ہو سکا کہ ثقافت جن لطیف مظاہر یا مشاعر سے متعلق ہے۔ ان کی مخصوص شکل کیا ہے۔ ظاہر ہے کہ کلچر، تمدن، تہذیب، سولزیشن یہ الفاظ جزوی ترادف کے باوجود مرادف نہیں۔ پھر کیا ہماری موجودہ اصطلاح "ثقافت" بھی کوئی اسی طرح کی ناقابل تعریف چیز ہے۔ یا اس کی کوئی جامع مانع تعریف کی جا سکتی ہے۔ میں نے آپ کی گراں قدر تصنیف "اعتقادیات اسلامی" یا "معتقدات اسلامی" بھی پڑھی ہے۔ اس میں بھی بعض بعض موقعوں پر یہ بحث آئی ہے۔ مگر موضوع کے فرق نے وہاں بھی بات کو صاف نہیں ہونے دیا۔ ان حالات میں اگر آپ آئندہ شمارے میں اس عجیب و غریب لفظ کے متعلق مزید تفصیل سے کام لیں تو بہت فائدہ ہوگا۔ اسی طرح کا ایک اہم سوال یہ ہے کہ ثقافت اسلامیہ کیا چیز ہے۔ کیا یہ دین اسلام کا دوسرا نام ہے یا دین سے کم کوئی مظاہرۂ ذہن یا مسلکِ عمل ہے۔ یا اس سے زیادہ کوئی مجموعہ آثار و خصائل ہے۔ اس طرح یہ بھی سوال پیدا ہوتا ہے۔ کہ اگر دین اور ثقافت کم و بیش مرادف الفاظ ہیں تو دین کی متعارف اور پسندیدہ تر اصطلاح کو ترک کرنے میں کونسی خاص مصلحت ہے۔ اور اگر دونوں میں کوئی تغائر یا تناقص ہے۔ تو دین سے تعارض کے اس میں کون کون سے پہلو ہیں۔

آپ کو یاد ہوگا۔ ایک مرتبہ پنڈت جواہر لال نہرو نے "اسلامک کلچر" اور "ہندو کلچر" کے نعروں کا مضحکہ اڑاتے ہوئے یہ کہا تھا کہ یہ وہ الفاظ ہیں جو کبھی شرمندہ معنی نہیں ہوئے اس وقت جناب پنڈت کے اس چیلنج کا کئی لوگوں نے جواب دیا تھا۔ اور یہ ثابت کیا تھا کہ ہندو کلچر کوئی حقیقت ہو یا نہ ہو اسلامک کلچر بہر حال ایک زندہ حقیقت ہے۔ مگر افسوس ہے کہ اس وقت یہ بحث اس وجہ سے تشنہ سی رہی کہ اس میں سیاست دخیل تھی۔ معترض نے اعتراض ہی سیاسی وجوہ سے کیا تھا۔ اس لئے اس کا سیاسی اور الزامی جواب اس کو مل گیا مگر اب جبکہ اس بحث میں کوئی پنڈت یا کوئی برہمن دخیل نہیں یہ بحث پھر اٹھائی جا سکتی ہے۔ اور یہ پوچھا جا سکتا ہے۔ کہ ہم جس اسلامک کلچر کے مدعی یا مبلغ ہیں۔ آخر اس کی حقیقت اور نوعیت کیا ہے۔ کیا یہ صرف عقیدہ اور زاویۂ نظر ہے یا کوئی عمل بھی۔ اور اگر یہ کوئی عمل ہے تو زمانی اور مکانی تسلسل نے اس کو حیاتِ اجتماعی کی کن کن روایات سے مربوط کر رکھا ہے اور اگر یہ روایات آج بھی زندہ ہیں۔ یا زندہ رہنے کے قابل ہیں تو ان کا حضورِ سرورِ کائنات اور قرونِ اولیٰ کے مسلمانوں کی زندگی سے بھی کچھ ربط ہے یا نہیں۔ غرض اس قسم کے گوناگوں سوالات و شکوک خیل در خیل اور قطار اندر قطار سامنے آجاتے ہیں۔ جن کا تشفی بخش جواب اذعان و ایقان کی کیفیت پیدا کرنے کے لئے بے حد ضروری ہے۔ محض یہ کہہ دینا کافی نہیں کہ جو لوگ زمانے کے ساتھ نہیں بدلتے زمانہ ان کو پیچھے چھوڑ دیتا ہے۔ اگر ثقافت اسلام کسی ازلی صداقت کا نام ہے۔ تو اس کو زمانے کے تغیرات کے تابع نہیں سمجھا جا سکتا۔

آپ کی عالمانہ تصریحات کے ضمن میں بعض دلچسپ اور بحث انگیز فقرات بھی آگئے ہیں مثلاً آپ نے فرمایا ہے کہ اس رسالے کا اصل مقصد دین کی ان بنیادی قدروں کو واضح کرنا ہے جن پر سارا عالم متحد ہو سکے۔ بے شک مجھے اس مقصد سے پورا پورا اتفاق ہے، کہ دین کی ان بنیادی قدروں کو واضح کیا جائے جن پر سارا عالم متحد ہو سکے۔ مگر سوال یہ ہے۔ کہ "بنیادی قدریں یا یہ عالمگیر صداقتیں تو روزِ ازل سے واضح اور ظاہر ہیں ان پر سارا عالم آج تک کیوں نہ متحد ہوا"۔ ایک وجہ تو یہی ہے (جیسا کہ آپ نے خود ہی فرمایا) کہ ان قدروں کو زندگی کے "اصلی مسائل" سے منقطع کر کے دیکھا جاتا رہا اور اگر سچ پوچھا جائے تو یہی زندگی کے مسائل عالمگیر اتحاد کے راستے میں سب سے بڑی رکاوٹ ہیں۔ پس اگر یہ سچ ہے۔ تو زندگی کے یہ اصلی مسائل کسی عقلی تجزیہ اور کسی معقول منصوبہ بندی کے بغیر کیسے حل ہونگے محض عالمگیر صداقتوں کی تشریح یا چند مجرد حقیقتوں کے اعلان سے تو زندگی کے ٹھوس مسائل نہ کبھی حل ہوئے ہیں نہ ہونگے رسالے عالم کے اتحاد کی عمارت کا بنیادی پتھر یہ ہے کہ دُنیا میں زندہ رہنے کے وسائل سب کے لئے یکساں طور پر مہیا ہوں تاکہ انسانوں کے دلوں میں وہ صفائی اور اعتماد پیدا ہو۔ جس کے نہ ہونے سے خُدا کی مخلوق طبقوں اور گروہوں میں تقسیم ہو کر ایک دوسرے کے خلاف صف آرا ہو رہی ہے میرا خیال یہ ہے کہ نیا زمانہ اور اس کے نئے تقاضے اس بات کا صاف مطالبہ کرتے ہیں۔ کہ اصلاح و تہذیب کی مہم مادہ سے شروع ہو کر تکمیل روحانی کی طرف بڑھتی جائے، نہ کہ بالعکس، مادہ اگرچہ سراپا زندگی ہے مگر زندگی کی راہ میں سنگِ گراں بھی ہے۔ اس لئے سب سے پہلے اس کی ہمواری کا سامان ہونا چاہئے۔ حجۃ الاسلام امام غزالیؒ نے منقذ میں ایک مقام پر لکھا ہے "تعجب ہے کہ لوگ دشواریوں کے آسان علاج چھوڑ کر مشکل تدبیروں میں لگے رہتے ہیں گھر کے چراغ سے آگ حاصل کرنے کی بجائے چقماق کی تلاش میں نکل کھڑے ہوتے ہیں۔ تاکہ اس سے آگ سُلگائیں" مجھے تو یہ محسوس ہوتا ہے۔ کہ ہمارا بھی کچھ ایسا ہی حال ہے۔ ہم جدید زندگی کی تشکیل میں ایسی تدابیر اختیار کرنا چاہتے ہیں جو بیحد ناقابل گرفت اور دشوار ہیں۔ مجھے تسلیم ہے کہ "دینِ صحیح" کی رہنمائی سے یہ سب کام آسان ہو سکتے ہیں۔ مگر سب سے بڑا سوال تو یہی ہے کہ "دینِ صحیح" کی تعریف بھی تو نہیں کی جا سکتی۔ اور جب حالت یہ ہے۔ تو پھر کیوں وُہ تدبیر اختیار نہ کر لی جائے جو قابلِ فہم بھی ہو۔ اور آسان بھی یعنی مادی مسائل کا محض عقلی حل" اس میں دین کو لانے کی کیا ضرورت ہے۔

آپ نے ایک فقرے میں تسکینِ رُوح کا سوال بھی چھیڑا ہے۔ مگر یہ سوال بڑا پریشان کُن ہے۔ چند دن پہلے میاں بشیر احمد صاحب نے بھی یہی سوال چھیڑا تھا کہ دراصل یہ کتاب زندگی کا وہ مستقل سوالیہ نشان ہے جس کی تفسیروں کی تعداد لاتعداد ہے۔ اور عجب یہ ہے۔ کہ جس قدر اس کے جواب زیادہ دیئے گئے ہیں اسی قدر اس کا جواب زیادہ مبہم ہوتا گیا ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ قرآن حکیم نے "الا بذکر اللہ تطمئن القلوب" کے ارشادِ پاک سے ہماری ڈھارس بندھائی ہے۔ مگر ارشادِ نبویؐ کا یہ اعتراف دیکھ کر کہ "حزن و غم میرا شریک حال رہتا ہے" (الحزن رفیقی) مجھے اس بدقسمت مخلوق یعنی انسان کی حالت پر رحم آتا ہے۔ اور یہ خیال ہوتا ہے۔ کہ شاید مولانا بحر العلوم کے بقول غم دائم اور فراقِ دائم ہی حیاتِ انسانی کا ایک لازمہ مستقل ہے۔ غرض سکونِ روحانی کی بحث (جو آپ کے دائرۂ مقاصد سے خارج نہیں) بغایت اہم اور بنیادی ہے ثقافت

کے مضمون نگار اس کے تجزیہ کی خاص کوشش کریں تو پڑھنے والوں کو بڑا فائدہ ہوگا۔

میری گزارشات کا خلاصہ صرف یہ ہے۔ کہ آپ آئندہ پرچوں میں جہاں تک ممکن ہو مندرجہ ذیل مباحث پر ضرور روشنی ڈالیں تاکہ وہ اشکال دُور ہوں جو بعض مبہم اصطلاحوں نے خواہ مخواہ پیدا کر رکھے ہیں۔ مثلاً:

اوّل: دین کیا ہے۔

دوم: ثقافت کلچر۔ تہذیب کیا ہے۔

سوم: ثقافتِ اسلامیہ کیا ہے اور اس کے وہ خاص نقوش کیا ہیں۔ جو اسکو دوسری ثقافتوں سے ممتاز کرتے ہیں۔

چہارم: زندگی کی تکمیل کی مہم کا رخ مادہ سے روح کی جانب ہو یا بالعکس۔

پنجم: کیا روحانی سکون ممکن ہے اگر ممکن ہے تو اس کے حصول کا کیا ذریعہ ہے۔

ثقافت کے اس شمارے میں جتنے مضامین شائع ہوئے ہیں سب کے سب نتیجہ خیز اور مفید ہیں۔ مگر امام غزالی کی سرگزشت انقلاب ایک ایسی روح پرور کہانی ہے جس کو اور بھی پھیلا کر بیان کیا جاتا تو اچھا ہوتا۔! دراصل انسان کی اصلاح کے لئے انسان کی سرگزشت سے زیادہ مؤثر کوئی چیز نہیں۔ میری تجویز یہ ہے کہ اگر آپ مناسب خیال کریں تو آئندہ پرچوں میں دُوسرے اعاظم رجال کی سرگزشت ہائے انقلاب بھی یکے بعد دیگرے پیش ہوتی رہیں۔ تاکہ دلوں کے عقدے حل ہوں اور باطن کی وہ ظلمتیں دُور ہوں۔ جن سے فضائے قلب نور سے محروم رہتی ہے۔ میں آخر میں یہ عرض کروں گا کہ آپ نے جن اعلیٰ مقاصد کے پیشِ نظر یہ پرچہ نکالا ہے۔ ان کی تکمیل موجودہ وقت کا سب سے بڑا تقاضا ہے۔ بحمداللہ کہ ثقافت کا یہ اوّلین نمبر ان توقعات کو باحسن وجوہ پورا کر رہا ہے۔ جو اس مجلّہ سے (آپ کے انتساب کے سبب) بجا طور پر وابستہ ہیں۔ ہر چند کہ یہ "اعلیٰ مقاصد ایسی جنس ہیں جنکی بازار میں مانگ نہیں"۔ مگر مجھے پورا اطمینان ہے کہ یہ رسالہ تھوڑے ہی عرصے میں اس جنس کی عام مانگ پیدا کر دیگا۔ کیونکہ جنس کی خوبی ہی مانگ کی کثرت کا ذریعہ ہوا کرتی ہے۔ ہمارے ملک میں یوں بھی اچھے رسالوں کی قلت ہے۔ اور اس موضوع پر تو شاید کوئی رسالہ موجود ہی نہیں۔ مجھے کامل توقع ہے کہ "ثقافت" ہماری حیاتِ فکری میں اسی طرح ایک تحریک اور تموج کا منبع ثابت ہوگا۔ جس طرح تقریباً ایک صدی قبل سرسیّد کا تہذیب الاخلاق ثابت ہوا تھا۔ والسّلام

نیازمند
سیّد عبداللہ

ثقافت: فاضل مراسلہ نگار کے خط سے بہ آسانی یہ اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ انھوں نے "ثقافت" کا پہلا شمارہ جس غور و فکر اور دلچسپی کے ساتھ پڑھا ہے اسی عمق اور شگفتگی کے ساتھ مخلصانہ اور آزادانہ تبصرہ بھی فرمایا ہے۔ بہت کم لوگ ہونگے جنھوں نے ماہنامہ ثقافت کے مقاصد اور اس کی اہمیت کو اس انداز سے محسوس کیا ہو اور اس کی کامیابی کے متعلق اتنے پُر اُمید ہوں۔ ممدوح نے جو مشورے دیئے ہیں وہ بھی بہت قابل قدر ہیں۔